ابوالکلام قاسمی

اقبال تنقید اور آل احمد سرور

علاّمہ اقبال کی فکر اور شاعری کے بارے میں رطب و یابس تحریروں کا اتنا بڑا ذخیرہ دستیاب ہے کہ اس میں سے نمائندہ اور قابل قدر مضامین اور کتابوں کی نشان دہی کی کوشش مشکل معلوم ہوتی ہے۔ تاہم اس بات کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کے فکر و فن کو اس کے پورے سیاق و سباق میں سمجھنے کی اہم اور قابل توجہ کوششیں کن ماہرین اقبالیات کی تحریروں میں ملتی ہیں۔

آل احمد سرور کا نام بلاشبہ موخر الذکر زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ آل احمد سرور نے اقبال کی شاعری سے اپنی دلچسپی اور اس پر غور و فکر کا سلسلہ اقبال کی زندگی میں ہی شروع کر دیا تھا، مگر ان کی ابتدائی زمانے کی تحریروں میں تلاش و جستجو بلکہ تجسس کے رجحان سے زیادہ اور کچھ نہیں ملتا۔ اقبال کی منظوم و منثور تحریروں کی تفہیم اور ان تحریروں کی مدد سے پورے اقبال کے نقوش مرتب کرنے کی دیانت دارانہ کاوش۔ ظاہر ہے کہ اقبال جیسے متنوع اور ہمہ جہت مفکر اور شاعر کی تمام جہات تک رسائی حاصل کرنا اور ان کے فکر و فن کی رنگا رنگی میں ترتیب و تنظیم کی جستجو میں کامیابی حاصل کر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بعض مضامین میں اپنی ان مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے جن سے وہ ابتدا میں نبرد آزما رہے۔ لیکن اگر سرور صاحب کے اس نوع کے مضامین کو زمانی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ سامنے رکھا جائے تو وہ گتھیاں کھلتی نظر آتی ہیں جن کو ہم اقبال فہمی کے مختلف مراحل کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ انھوں نے اقبال پر اندازاً دو درجن مضامین، متفرق انداز میں لکھے ہیں اور بیس مضامین کا مجموعہ ''دانش اور اقبال'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان تحریروں میں ابتدائی برسوں کے مضامین کے علاوہ بیش تر مضامین میں اقبال کے افکار اور فنی اسرار و رموز کو دقّتِ نظر سے سمجھنے کا رویّہ ملتا ہے۔ کہیں اقبال کی مشرقیت کو موضوع بنایا گیا ہے تو کہیں اقبال اور اشتراکیت کے رشتے کی عُقدہ کشائی کی گئی ہے، کسی مضمون میں تصوّف کے حوالے سے اقبال کی فکر زیرِ بحث ہے تو کسی مضمون میں اقبال کے خطیبانہ لہجے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مضامین میں مابعد الطبیعات اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید، جیسے عالمانہ موضوعات سے لے کر تصوّرات کو شاعری بنانے کے مسائل تک، اپنے دائرۂ کار کو وسیع رکھا گیا ہے۔ مگر سرور صاحب کی اقبال فہمی کے ابتدائی مرحلے کے پس منظر کے طور پر ان کے ایک ایسے خط کا ذکر کرنا مناسب ہو گا جو اقبال کی تحریروں سے ان کی سچی دلچسپی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ماہ نو (کراچی) کے خاص نمبر (۱۹۴۹ء) میں ''اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط'' کے عنوان سے سرور صاحب کا ایک نوٹ اور علامہ اقبال کے خط کی نقل شائع ہوئی تھی۔ اس میں سرور صاحب نے اپنے ایک ایسے خط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے اپنے ادبی سفر کے آغاز میں اقبال کو لکھا تھا۔ پورے خط کے مضمون کو خود انھوں نے اس طرح اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے:

بارہ سال کا عرصہ ہوا جب میں نے اقبال کو ایک خط لکھا تھا اس خط میں بہت سے سوالات تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اوّل تو اشتراکیت اور فاشزم سے متعلق ان کی رائے دریافت کی تھی۔ دوسرے بعض نظموں میں جو تضاد نظر آتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا تھا، تیسرے خاص طور پر ''بال جبریل'' میں مسولینی پر جو نظم ہے اس پر اعتراض کیا تھا اور اس کا مقابلہ ''ضربِ کلیم'' کی نظموں سے کر کے دونوں کا فرق ظاہر کیا تھا، اس زمانے میں میرا ادبی شعور خاصا خام تھا۔ اقبال کا کلام بہت پڑھا تھا۔ مگر شروع سے آخر تک باقاعدہ مطالعہ نہ کیا تھا۔ ان کے لکچر نہ دیکھے تھے۔ اقبال کا قائل ہونے کے باوجود ان کے یہاں فاشزم کے اثرات جا بجا نظر آتے تھے، اس لیے یہ خط لکھا گیا تھا۔

سرور صاحب نے اپنے خط کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ناپختگی کا بھی ذکر کیا ہے اور شروع شروع میں اقبال کی تمام تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کرنے کا بھی اعتراف کیا ہے۔ یہ بات اندازاً علامہ اقبال کی وفات سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۳۷ء کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نوجوان اور ناآزمودہ کار متلاشی کا تجسس اور ایک سنجیدہ طالب علم کا دیانت دارانہ استفسار اس بیان سے نمایاں ہے جو بہرحال قابل قدر بھی ہے اور علمی تفحص پر دال بھی۔ یوں تو سرور صاحب کے سوالات کے جو جوابات علامہ اقبال کے خط میں ملتے ہیں وہ اپنی جگہ ان کے واضح نقطۂ نظر کو سامنے لاتے ہیں، لیکن اس خط و کتابت سے آل احمد سرور کے اس گہرے سروکار کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے جو ان کی اقبال فہمی کے مختلف مراحل کو بھی نمایاں کرتا ہے اور اقبال سے ان کی سچی وابستگی کو بھی۔ علامہ اقبال نے ان کے خط کا قدرے تفصیلی جواب دیا تھا تاہم اس خط کے بعض نکات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اپنے ۱۲/ مارچ ۱۹۳۷ء کے جوابی خط میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔ میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم، یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطہ نظر سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگر آپ پورے غور اور توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ آپ انہیں نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں۔ اس صورت میں غالباً آپ کے شکوک تمام کے تمام رفع ہو جائیں۔

۲۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے کلام کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو میں آپ کو یہ دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس طرف توجہ کریں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی باتیں خود بہ خود آپ کی سمجھ میں آ جائیں گی۔

۳۔ مسولینی کے مطابق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں آپ کو تناقذ (کذا) نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن اگر اُس بندۂ خدا میں Devil اور Saint دونوں کے خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا کروں.........

۴۔ آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لکچرر ہیں۔ اس واسطے مجھے یقین ہے کہ آپ لٹریچر کے اسالیبِ بیان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوب بیان ہے۔ اسلوب بیان کو

شاعر کا حقیقی view تصور کرنا کسی طرح درست نہیں۔

آپ کے دل میں جو باتیں پیدا ہوئیں ہیں۔ان کا جواب بہت طویل ہے اور میں بحالِ موجودہ طویل خط لکھنے سے قاصر ہوں۔

نہیں معلوم کہ علامہ اقبال کے مشورے کے مطابق سرور صاحب نے حقائق اسلامیہ سے کتنی واقفیت بہم پہنچائی۔مگر ان کی بعد تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کو حتی الامکان پورے سیاق وسباق میں دیکھنے اور سمجھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔اس باعث مجنوں گورکھپوری یا ان کی قبیل کے بعض دوسرے ترقی پسند نقادوں کے اس اعتراض کے کھوکھلے پن کو سمجھنے میں وہ کامیاب ہوئے کہ اقبال کے یہاں شاہین کے استعارے پر زور اور جلال کی صفت پر اصرار گویا فسطائی رویے کی نمائندگی کرتا ہے۔سرور صاحب نے بجا طور پر اس بات کی وضاحت کی کہ جلال کے ساتھ جمال، عقل کے ساتھ عشق اور طاقت کے جبروت کے ساتھ فقر وقناعت، کیوں کر انسان کامل کے ترکیبی عناصر بن جاتے ہیں، کہ ایک مرحلے پر یہ عناصر ایک دوسرے سے متصادم نہیں معلوم ہوتے بلکہ شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔

علّامہ اقبال ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کے افکار اور شاعری پر غور وخوض کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ان کے انتقال سے تقریباً پانچ سال قبل ۱۹۳۳ء میں ''نیرنگِ خیال'' کا اقبال نمبر شائع ہوا تھا، جس میں ان کی نثر ونظم کی جہات کا بڑی حد تک احاطہ کیا گیا تھا۔لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ابتدائی زمانے میں ان کی شاعرانہ حیثیت سے کہیں زیادہ ان کا فلسفۂ زندگی زیرِ بحث رہا۔آل احمد سرور کی تنقیدی تحریروں میں بھی ابتدائی دہائیوں میں اقبال کے افکار پر زیادہ توجہ ملتی ہے۔ چونکہ سرور صاحب شعر وادب کے نقّاد ہونے کے ساتھ ہمیشہ دانش ورانہ فکر کے شیدائی رہے ہیں، اس لیے اقبال کی دانش وری نے بھی ان کی توجہ اپنی طرف پہلے مبذول کرائی۔ان کے مضامین میں دانش ور اقبال، اقبال کی مشرقیت، تشخص کا مسئلہ، اقبال اور جمہوریّت اور اقبال کی سیاسی فکر جیسے موضوعات اس طرزِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ سرور صاحب نے اقبال کی شاعرانہ حیثیّت سے صرفِ نظر کیا ہو۔لیکن انھوں نے نسبتاً بعد کے مضامین میں اقبال کی غزل گوئی، نظم نگاری اور فنّی مسائل وموضُوعات پر بھی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔اقبال کی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے سرور صاحب نے ان کے خُطبات اور نثری بیانات کو جگہ جگہ موضوع بنایا ہے۔ان کی شکایت ہے کہ اقبال کی صحیح تفہیم سے کہیں زیادہ ان کے لیے تحسین اور مبالغہ آمیز توصیف کا رویہ اپنایا گیا ہے۔اقبال کی دانش وری پر گفتگو کرتے ہوئے وہ بجا طور پر قدر شناسی اور توصیفی طریق کار پر اپنے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں:

> اقبال نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی ایک حسّاس بیدار مرتب اور منظّم ذہن کا لافانی نقش چھوڑا۔اس کی قدر تو بہت ہوئی مگر اس کا عرفان عام نہ ہو سکا۔کیونکہ برِصغیر میں وہ ذہن جو ہندوستانی مسلمانوں کی پونجی ہے اور وہ تہذیبی میراث جو اُردو ادب کے ذریعہ عام ہوئی ہے، ابھی تک پرستش کی دل دادہ ہے، عرفان کی نہیں، تحسین کی قائل ہے تجزیے کی عادی نہیں، ساحل سے نظارہ کرتی ہے سمندر میں نہیں اترتی، اسے صدف سے

مطلب ہے گہر سے نہیں۔

مگر اس بیان میں حُسنِ بیان کا لُطف تو ضرور موجود ہے، پورے مضمون میں خود بھی تجزیہ اور تحلیل سے سروکار نہیں رکھا گیا ہے۔ سرور صاحب اقبال کے افکار کا ذکر تو بار بار کرتے ہیں، لیکن ''اسرار خودی''، ''رموز بےخودی''، جیسی طویل نظموں اور شاعرانہ فکر سے آگے جانے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ سرور صاحب خود بھی اقبال کی مابعد الطبیعاتی فکر اور خطبات کی طرف بڑی مشکل سے متوجہ ہوتے ہیں۔ اقبال نے اپنے خطبات میں نصِ قطعی، احادیث اور فقہہ کے جن نکات پر اپنی رائے دی ہے اور مسلمانوں کی عام فکر اور جبر و اختیار کے مسائل پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے دور دور رہنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ اقبال نے اسلام کے ماخذ پر جس عبور کا مظاہرہ کیا ہے اس نوع کی دسترس اور مذہبی واقفیت کے بغیر خُطبات پر قلم اٹھانا اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنے کے مُترادف معلوم ہوتا ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کی متصوّفانہ فکر پر البتہ توجہ صرف کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''اقبال وحدۃ الوجُود کے یکسر مخالف نہ تھے، اس کی عملی تعبیر اور فلسفہ وشاعری میں اس کے منفی اثرات کے مخالف تھے''۔ یہاں اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے ''ایران میں بعد الطبیعات کے ارتقا'' میں اقبال نے بنیادی طور پر اس بات سے سروکار رکھا ہے کہ وحدۃ الوجود میں بھگتی کے جو اثرات شامل ہوئے تھے ان کے باعث وحدۃ الوجودی فکر کے زیر اثر تقدیر کا غلط تصور رائج ہوا، اور اسی باعث انسان کو اس حد تک مجبور محض سمجھ لیا گیا کہ اس کے ارادہ و اختیار کو بے معنی تصور کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقدیر پرستی کی لیے اس حد تک بڑھی کہ انسان کے اختیار کو ایک الزام اور ایک تُہمت کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ چونکہ اس تصور نے ایران اور ہندوستان میں مسلمانوں سے قوتِ عمل چھین لی اور انفعال، مُجہولیّت اور ناکارکردگی کو نیکی اور مثبت قدر کا بدل سمجھ لیا گیا، اس لیے اقبال مدلل انداز میں اس بات پر توجہ دلاتے ہیں کہ جبر و اختیار کا اسلامی مفہوم کیا ہے اور کیونکر اپنی حالت کے بدلنے کی تدابیر کے بغیر صرف ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے میں کوئی خیر کا پہلو پُوشیدہ نہیں۔ اس ضمن میں آل احمد سرور نے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ''اسرار خودی'' کے دیباچے اور اقبال کے بعض خطوط کو حوالہ بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال اور تصوّف کے موضوع پر ''اسرار خودی'' کے دیباچے میں محض بنیادی باتیں بیان کر دی گئیں ہیں، اس سلسلے کا اتمامِ حُجّت اقبال کے خُطبات اور ان کے تحقیقی مقالے میں ملتا ہے، جن کے حوالے سے سرور صاحب کی تحریروں میں کوئی بات نہیں ملتی۔ اقبال نے واضح لفظوں میں لکھا تھا کہ ''عجمی تصوّف جُزو اسلام نہیں، یہ ایک قسم کی رہبانیت ہے، جس سے اسلام کو قطعاً تعلق نہیں اور جس کے اثر سے اسلامی اقوام میں قوتِ عمل مفقود ہو گئی ہے''۔ لیکن اقبال کے اس خیال سے ان کی تحقیق کا بنیادی تصور سامنے آتا ہے اور وہ بھی تصوّف کے محض ایک مکتبِ فکر ''وَحدتُ الوجود'' کے حوالے سے۔ جب کہ ''وحدۃُ الشھود'' کے سلسلے میں اقبال ہر جگہ رَطبُ اللسان ہیں اور اس تصور میں وہ عجمی اثرات کی شمولیت نہیں پاتے۔

آل احمد سرور نے تصوف کے حوالے سے اقبال کی تصوّرِ عشق کی بحث بھی چھیڑی ہے۔ وہ کبھی اقبال کے تصوّرِ عشق کو اردو یا فارسی غزل کے تصوّرِ عشق سے الگ قرار دیتے ہیں، کبھی بعض صوفی شاعروں کے عشق کو

اقبال کے تصورِ عشق کا سرچشمہ بتاتے ہیں اور کبھی اسے محض غیر جنسی عشق کہہ کر اپنی بات مکمل کر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

عشق کا تصور جو میر یا درد یا غالب یا اقبال کے یہاں ملتا ہے، جنسی تجربہ نہیں ہے، اس سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کے یہاں تو اس کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ:

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو عقل و دیں بت کدۂ تصورات

یعنی یہ عشق ستے معنی میں عقل کی ضد نہیں بلکہ باطنی نظر ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کا ایک وسیلہ اور رہنما۔

اس بیان میں عشق کے حوالے سے اس قدر خلط مبحث ہے کہ اس کی وضاحت خاصی تفصیل کی متقاضی ہے۔ تاہم یہ وضاحت یہاں ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں عشق کا تصور یقینی طور پر حقیقی اور مجازی معنوں کا احاطہ کرتا ہے مگر میر ہوں، میر درد ہوں یا غالب، یہ سارے شعراء اس تصوّرِ عشق کے پروردہ ہیں۔ جبکہ اقبال کا عشق ایک بالکل مختلف سیاق و سباق کا حامل ہے۔ اقبال کا عشق ایک قوّتِ حیات ہے، اپنے مقصد اور مدعا سے غیر معمولی شغف ہے، اس کی تکمیل جمال کے ساتھ جلال سے اور غیر معمولی حرکت و عمل سے ہوتی ہے۔ اقبال کے اس تصوّرِ عشق کے رموز اس وقت تک ہمارے ہاتھ آ ہی نہیں سکتے جب تک ہم رسول کریمؐ اور قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کے خونِ جگر سے نمود پانے والے جذبے اور لگن سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے نہیں دیکھتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ قُرطبہ کی مسجد جیسے عظیم فن پارے کو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے جذبۂ عشق کا زائیدہ بتانے پر اپنی نظم میں اس قدر زورِ صرف نہ کرتے اور سلسلۂ روز و شب کی تمام تعمیری اور تخریبی قوتوں کے لیے:

؎ عشق خود اِک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

کا نام نہ دیتے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ صُوفیانہ تصوّرِ عشق اور مجازی تصوّرِ عشق سے الگ اقبال کے عشق کو مخصوص سیاق و سباق میں دیکھا جاتا اور اس کے شواہد اقبال کے کلام میں تلاش کیے جاتے۔

آل احمد سرور نے اپنے متعدد مضامین میں اقبال کی مشرقیت کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال کو شاعرِ اسلام بھی کہا جاتا ہے اور شاعرِ مشرق بھی۔ دونوں باتیں اپنے اندر جزوی صداقت رکھتی ہیں۔ جہاں تک مشرقیّت کا سوال ہے تو اقبال کے حوالے سے سرور صاحب، مطلق مشرقیت کے بجائے نئی مشرقیّت کا نام تجویز کرتے ہیں۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ سرور صاحب کو یہ اندیشہ ہے کہ اقبال کو محض مشرقیت کا دلدادہ قرار دینے سے، کہیں نئی مغربی روشنی سے ان کی محرومی کا اثر نہ قائم ہو جائے۔ اس لیے ان کے نزدیک نری مشرقیّت کوئی مستحسن چیز نہیں، البتہ نئی مشرقیت ان کے لیے مغربی تہذیب و آ گہی سے واقفیت کا اثر بلکہ اس کا ردِ عمل ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں ''جدید اور مشرقی اقبال'' کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں کہ:

.........دوسری مشرقیّت وہ ہے جو ہمیں اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ یہ نئی مشرقیّت ہے اور مغرب کے اثر سے

وجود میں آئی ہے۔ یہ ہندوستانی نشاۃِ ثانیہ کا عطیہ ہے۔

اس سلسلے میں سرور صاحب نے سرسیّد کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا نمائندہ قرار دیا ہے اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ ''اگر سرسید نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے''، ہوسکتا ہے کہ سرسیّد کی تحریک اور نئی بیداری کا ردِعمل بقول سرور صاحب ''اقبال پر یہ ہوا ہو کہ انھوں نے سرسیّد کی طرح مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کا آئیڈیل بنانے کے بجائے جدید مغربی ثقافت کے کُھوکھلے پَن کا اندازہ لگانے کے بعد مشرقی اقدار حیات اور مذہبی بنیادوں پر غور و خوض کا سلسلہ نئے سرے سے شروع کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ اقبال نے جو یہ کہا کہ:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

.........اس شعر کے ضمن میں بقول آل احمد سرور، ابلۂ مسجد کی وضاحت ''جامد مذہبی تصوّرات اور صرف عقائد و عبادات'' سے اور ''تہذیب کا فرزند'' کی تشریح کی تعبیر مغربی افکار و اقدار کی تقلید اور اسی میں نجات کو محسوس کرنا'' جیسے رَوَیّوں سے کی جاسکتی ہے۔ ان وضاحتوں میں جامد مذہبی تصورات کی بات تو قابل فہم ہے لیکن عقائد کی نمائندگی کرنے والوں کو اقبال کا ابلۂ مسجد قرار دینا کسی بھی طرح نہ قابل قبول ہے اور نہ اقبال کی پوری فکر کے حوالے سے قرین قیاس۔ اقبال نے اسلام کے اصولی معاملات کے سلسلے میں کبھی بھی کسی طرح مفاہمت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ ریا کاری اور ظواہر کا معاملہ بالکل الگ ہے اور اقبال اس پر معترض بھی ہوتے ہیں۔ مگر عبادت و عقائد کو علی الاطلاق اقبال کا ھدف ثابت کرنا اقبال کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے جس کی توقع کم از کم آل احمد سرور جیسے اقبال فہم سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس تسامح کا حل ہمیں سرور صاحب کے مضمون ''اقبال اور نئی مشرقیّت'' میں ملتا ہے جہاں انھوں نے ظواہر پرستی اور بے روح مذہبیت کو اقبال کا اصل ہدف بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> یہ بات واضح ہے کہ اقبال مثلاً اکبر کی طرح مشرقیّت کے علم بردار نہیں اور مشرق کے جمود، مزاجِ خانقاہی، تقدیر پرستی اور بے عملی پر وار کرتے ہیں''۔

سرور صاحب نے مشرق کے حوالے سے اقبال کی ترجیحات کا ذکر اپنے مضامین میں جگہ جگہ کیا ہے مگر مشرق کی روحانیت کو مغرب کی مادیت، مشرق کے جمال کو مغرب کے جلال اور مشرق کے جذبے اور عشق کو مغرب کی تعقّل پسندی اور بے روح مادی ترقی کے تناظر میں پیش نہ کر کے اقبال کی مشرق پسندی کے بنیادی سروکار کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سرور صاحب قصۂ جدید و قدیم کو دلیل کم نظری کہتے ہیں، مشرق سے بیزاری اور مغرب سے احتراز کی ممانعت کرتے ہیں اور ہر شب کو سحر کرنے کا مشوّرہ دیتے ہیں، یا پھر عشق کی بدولت کفر کو مسلمانی اور عشق کے بغیر مردِ مسلماں کو کافر و زندیق کی صورت میں دیکھتے ہیں۔۔۔ یہ باتیں شاعرانہ اس لیے نہیں معلوم ہوتیں کہ سرور صاحب کی اپنی اختراع نہیں بلکہ یہ تمام نکات اقبال کے مختلف اشعار کو نثری شاعری بنا کر پیش کرنے کی مثالیں ہیں۔ سرور صاحب کی تنقید میں جس آرائشی رائے زنی کو متعدد نقّادوں نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے اس کا ایک بڑا مظہر یہ بھی ہے کہ بسا اوقات اچھے اشعار کی تعیّنِ قدر کی بجائے وہ اپنی نثر میں

شعری خیالات کو تبدیل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طریق کار کو ادبی تنقید کا نعم البدل سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ذیل کے بعض فقروں سے اس انداز نقد کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے اور اس اشعار کی بازگشت بھی محسوس کی جا سکتی ہے جو تنقید نگار کے رنگین اسلوب بیان کا محرک ہیں۔ اقبال کے بعض اشعار کی نثری صورتیں سرور صاحب کی تحریر میں آ کر کچھ یوں ہو جاتی ہیں:

اقبال ماضی پرست نہیں، ماضی شناس ہیں۔ ان کی نگاہ کوفہ و بغداد کی طرف نہیں وہ تازہ بستیاں آباد کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ وہ دلکشا صدا پر زُور دیتے ہیں مگر ان کا فن دِل گدازی اور دِلکشائی دونوں کو اہمیت دیتا ہے۔ انھوں نے جہاں ابلہ مسجد پر طنز کی وہاں تہذیب کے فرزند پر بھی۔۔۔ انسان کو طوافِ شمع سے آزاد اور اپنی فطرت کی تجلّی زار میں آباد ہونا چاہیے۔

مختلف شعروں کی مدد سے جملوں کی تراش وخراش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تنقید نگار کی تنقیدی منطق مفقود اور مُدّعا ضبط ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے تنقیدی بازآفرینی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ انداز تحریر یوں تو سرور صاحب کی تنقید میں بہت عام ہے مگر اقبال کے معاملے میں اس لیے بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ سرور صاحب کے لیے اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ زبان زد معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کی بازگشت کا در آنا قدرے فطری بھی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ اندازِ تحریر سرور صاحب کے مختلف اسالیب میں سے محض ایک اسلوب ہے۔ وہ کبھی کبھی نہایت منطقی اسلوب میں بھی نتائج کا استخراج کرنے پر قادر ہیں اور اپنے نتائج کو بسا اوقات اپنی ظاہری ترجیحات کے برخلاف بھی پیش کرنے میں تکلف محسوس نہیں کرتے۔ وہ اسلام کو اقبال کی نگاہ میں ایک ایسا سوشلزم قرار دینے کے بعد کہ جس پر ابھی پوری طرح غور نہیں کیا گیا، اسلام کی روایت کو مشرق کی صالح اقدار کا نام دینے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

اقبال پر مغربیّت کے اثر نے ان کی نئی مشرقیت کو جنم دیا۔ یہ نئی مشرقیت ماضی کے صالح عناصر و روحانی بصیرت کے ساتھ جمہوری خیر کے تقاضوں کو قبول کرتی ہے جس کی مغرب میں ایک شاندار داستان ہے، جو سائنس اور ٹکنالوجی کی برکتوں اور نعمتوں، دونوں کو پہچانتی ہے۔''

اقبال، اکثر مشرق کو اسلام کی مشرقی تعبیرات کے پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ اس باعث اسلامی تشخص کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کرتے ہوئے رسول کریمؐ کی زندگی کو اس پورے پس منظر میں عینی اور مثالی نمونہ قرار دیتے ہیں اور اپنی نام نہاد مغرب پرستی کو اپنے نتائج کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ لکھتے ہیں کہ:

اسلامی تشخص ان (اقبال) کے نزدیک عرب کی شہنشاہیت کو اُس فقر غیور سے ایک انحراف سمجھتا ہے جس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں ہے۔ اور جسے اسلام کی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر جمال کے ساتھ۔ اس میں قوت مقصود بالذات نہیں مگر ایک اخلاقی مشن کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے''۔

کلیم الدین احمد نے اردو تنقید پر ایک نظر میں، آل احمد سرور کی تنقید نگاری، بلکہ تنقید میں ''ان کے اسلوب نگارش''، پر تفصیل سے لکھا ہے۔ کلیم صاحب کو سرور صاحب کے یہاں گومگو کی کیفیت پر سخت اعتراض ہے اور وہ آل احمد سرور جیسے باشعور ادبی نقاد سے زیادہ منطقی، زیادہ مدلّل اور غیر آرائشی زبان کا تقاضہ کرتے

ہیں۔اس سلسلے میں انھوں نے سرور صاحب کے تنقیدی تصورات اوران کے اطلاق سے بھی بحث کی ہے جس پر تفصیلی اظہار خیال کرنا اپنے موضوع سے صرفِ نظر کرنے کے مصداق ہو جائے گا، البتہ اس موقع پر کلیم صاحب کے ایک مشورے کا اعادہ کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے ''سخن ہائے گفتنی'' میں دیا ہے۔شاید پہلے یہ تحریر رسالہ معاصر پٹنہ میں شائع ہوئی تھی، جس میں سرور صاحب کے ایک تنقیدی ردِعمل کا جواب دیا گیا تھا۔کلیم صاحب کہتے ہیں کہ ''میرا مشورہ ہے کہ سرور صاحب عام تنقیدی مضامین لکھنے کے بجائے کبھی کسی ایک غزل یا ایک نظم کو موضوع بنا کر عمیق و بسیط انداز میں بھی اس کا مطالعہ پیش کریں اور اسی مطالعہ کی بنیاد پر تنقیدی رائے قائم کریں۔خدا جانے اس مشورے کے بعد سرور صاحب کا وسیع تنقیدی مطالعہ عمیق تنقیدی مطالعہ کی طرف متوجہ ہوا یا نہیں، لیکن اقبال کے سلسلے میں سرور صاحب نے عمق کے ساتھ بھی بعض فن پاروں کو جائزے کے عمل سے گزارا ہے۔آل احمد سرور نے ایک مضمون ''اقبال کا کارنامہ اردو نظم میں'' کے عنوان سے لکھا ہے۔نظم کا صنفی تصور، مغرب میں نظم کی ہیئت اور تکنیک اور مشرق میں نظم کی روایت، تینوں پہلوؤں سے مصنف کو پوری واقفیت حاصل ہے اور اس کے نزدیک کوئی بھی انداز نظر واحد مثالی انداز نظم نہیں۔اس پس منظر میں سرور صاحب مغربی نظم کے ''عضویاتی کل'' والے نظریے کو کلیم الدن احمد کے توسط سے بحث کا موضوع بناتے ہیں۔

> کلیم الدین احمد نے نظم کے لیے ناگزیر ربط اور ناگزیر ترتیب کی شرط لگائی ہے، مگر میرے نزدیک یہ نظم کا میکانکی تصور ہے۔شاعری میں مسلسل پرواز بھی ہوتی ہے اور جستوں اور پروازوں کا ایک سلسلہ بھی۔۔۔
> کلیم الدین احمد نے ارتقائے خیال کا بھی ذکر کیا ہے۔۔۔پو، نے تو ہر طویل نظم کو مختصر نظموں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔مغرب میں جس طرح نظم کا ارتقا ہوا ہے اس طرح ہمارے یہاں نہیں ہوا۔

سرور صاحب کا کہنا ہے کہ ''اگر ان نظموں کے موضوع اور اقبال کے ادبی ماحول اور ابلاغ کی ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے تو کلیم الدین احمد کے اعتراضات بے جا معلوم ہوتے ہیں۔وہ مزید کہتے ہیں کہ ''کلیم الدین احمد مشرقی اور ہندوستانی روایت کا سرے سے لحاظ نہیں رکھتے''۔سرور صاحب کی نظر میں ''شاعری کا شاعری ہونا پہلے ضروری ہے بعد میں خواہ وہ اچھی شاعری ثابت ہو، خطیبانہ شاعری قرار پائے یا اسے اعلیٰ شاعری کے نام سے یاد کیا جائے''۔۔۔لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کلیم الدین احمد کی بات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔اگر سرور صاحب کو غزل کی صنف کے تعیّن کا حق اس لیے حاصل ہے کہ یہ صنف فارسی اور اردو میں ایک روایت کی شکل اختیار کر چکی ہے اور کوئی خواہ اس کی ریزہ خیالی پر اعتراض کرے یا افکار پریشاں پر، یہ صنف مخصوص ہیئت سے ہی پہچانی جاتی ہے اور اسی ایجاز و اختصار میں علامتی اظہار کا جواز پوشیدہ ہے اور یہی کفایت لفظی اس صنف سخن کو طول کلامی سے اجتناب کا ہُنر سکھاتی ہے، تو کلیم الدین احمد کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ مغرب میں ترتیب یافتہ صنف ''نظم'' کے مصرعوں کی ناگزیریت، ترتیب اور ربط وغیرہ کو اس صِنفِ سخن کی تنقید کی اساس بنائیں اور عضویاتی کل جیسے عناصر کو کسی نظم میں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔لیکن جو بات سرور صاحب کے حق میں جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ''نظم'' کی صنف محض مغرب کی صنف نہیں۔مشرق میں غزل، قطعہ اور رباعی کے علاوہ تمام اصناف، نظم کے بڑے کُل کے مصداق کی حیثیت رکھتی ہیں۔چونکہ قصیدہ،

مرثیہ یا مثنوی وغیرہ نے بعض دوسرے فنّی اور فکری لوازم کی آمیزش اور تعیّن سے اپنی حدیں متعین کر لی ہیں، تو کم از کم نظم یا جدید نظم کو اسی طرح مشرقی صنف کہہ سکتے ہیں جس طرح یہ ایک مغربی صنف ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مغرب میں اس صنف کی کتر بیونت اور اس پر غور و فکر میں کئی صدیاں گزاری گئی ہیں۔ لیکن اردو نظم کے جائزے میں اگر ہم کلیم الدین احمد کی طرح مغربی تصورِ نظم کو واحد معیار بنانے کی کوشش کریں، تو اس طریق کار سے مشرقی نظم کو پورا انصاف نہیں دلایا جا سکتا۔ اسی طرح اگر سرور صاحب کی طرح مغربی اصولوں سے صرف نظر کر کے محض مشرقی اصولوں کی بنیاد پر اردو نظم کی تنقید کا اسلوب طے کر لیا جائے تو شاید یہ طریق کار غلط تو نہ ہو لیکن دوسرے نقطۂ ہائے نظر کی موجودگی میں نامکمل اور اکہرا تنقیدی طریق کار ضرور کہلائے گا۔۔۔

یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے کلیم الدین احمد نے اور قدرے بعد میں اردو کے بعض نمائندہ جدید نقّادوں نے اردو نظم کو بھی مغربی تنقیدی پیمانوں کی بنیاد پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ انگریزی میں ایف۔ آر۔ لیوس اور اس کے بعض معاصرین نے جس طرح نظم کو ایک 'عضویاتی کُل' قرار دیا اور اس 'عضویاتی کل' کے اجزاء میں کسی عمارت کے اجزاء جیسا ربط دیکھنے کے بجائے کسی نمو پذیر درخت کی شاخوں اور پتوں جیسا ربط ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ نظم کی ترکیبی عناصر نے کیا خیال یا موضوع کے اندر سے نمو پذیری حاصل کی ہے یا پھر اس کے اجزاء صرف خارجی طور پر اس سے وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ آئی۔ اے رچرڈس، ایف۔ آر۔ لیوس اور ایمپسن وغیرہ کے زیر اثر نئی مغربی تنقید نے چونکہ نظم کے تجزیے اور تشکیلی عناصر کی تلاش و جستجو میں نظم کی تنقید کو ایک نوع کا مخصوص طریقہ کار بنا دیا، اس لیے تجزیے، تحلیل اور شعری عناصر ترکیبی پر توجہ دیئے بغیر اب کسی بھی صنف کی تنقید کے بجائے تصوراتی اور نظریاتی حدود سے آگے جاتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔

اس سیاق و سباق میں سرور صاحب نے جہاں کہیں اردو نظم نگاری میں اقبال کی ہنرمندیوں کا ذکر کیا ہے وہاں کسی نہ کسی عنوان سے انھوں نے کلیم الدین احمد کے ان اعتراضات کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں کلیم صاحب نے اقبال کی نظموں میں ربط تسلسل کے فقدان، نظم میں بعض غیر ضروری اشعار یا بند کی شمولیت، خودی، عشق، اور فقر کی تکرار اور اقبال کے خطیبانہ اسلوب پر سخت گیر تنقیدی رویہ اختیار کیا ہے۔ ان تمام اعتراضات کو بھی سرور صاحب بسا اوقات کلیم الدین کا نام لے کر اور اکثر ان اعتراضات کا صرف پس منظر قائم کر کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر سرور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اگر نظموں کے موضوع اور اقبال کے ادبی ماحول اور ابلاغ کی ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے تو کلیم صاحب کے اعتراضات بے جا معلوم ہوتے ہیں''۔ آگے اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے وہ کلیم صاحب کے اعتراضات کو بھول نہیں پاتے اور کچھ اس طرح جواب کا انداز اختیار کرتے ہیں:

> یہاں صرف یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ شاعری ہے یا نہیں، یہ شاعری خطیبانہ بھی ہو سکتی ہے، اچھی شاعری بھی اور اعلیٰ شاعری بھی۔ بعض لوگ مشرقی اور ہندوستانی روایت کا سرے سے لحاظ نہیں رکھتے۔

اس بیان کے پردۂ زنگاری میں سوائے کلیم الدین احمد کے اور کون معترض ہو سکتا ہے۔ اس بیان کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ کہ، کیا شاعری کو محض شاعری کی حیثیت سے تسلیم کر لینے سے تنقید کے سارے

مسائل حل ہو جاتے ہیں۔اس سلسلے کی دوسری شق یہ ہے کہ عام شاعری اور خطیبانہ شاعری کے لوازم کیا ہیں اور کیا خطابت کے لہجے کے باعث شاعری اپنی تہہ داری سے محروم ہو جاتی ہے اور اس بیان کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اقبال یا کسی بھی اردو کے شاعر کے مطالعہ میں کیا صرف مشرقی تصوّرِ شعر سے کام چلایا جا سکتا ہے؟۔یا پھر یہ کہ مغربی طرز تنقید کو واحد معیار بنا کر اردو کی شاعری کی پرکھ کی کوشش ہمیں کن اور کیسے نتائج تک لے جا سکتی ہے؟ طرز استدلال سے صاف ظاہر ہے کہ سرور صاحب خطابت کو شاعری کے منافی قرار نہیں دیتے۔انھوں نے اپنی تحریروں میں ایک سے زیادہ مقامات پر اقبال کی نظم 'طلوع اسلام' کے خطیبانہ لہجے کا ذکر کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اس نظم کی شعریت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مغربی معیار نقد پر مشرقی فن پاروں کو پرکھنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں سارا الزام کلیم الدین احمد کے سر ہی کیوں رکھا جائے۔خود سرور صاحب بھی ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی شاعری کی تین آوازوں کو جا و بے جا تنقیدی اصول سے کہیں زیادہ تنقیدی محاورے کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔اقبال پر لکھی ہوئی اہم اردو کتابوں کے مقابلے میں انگریزی زبان کی کسی کتاب کو بار بار اپنے حوالے کے طور پر زیر بحث لاتے ہیں اور آئی۔اے رچرڈس کے جذباتی اور حوالہ جاتی معنی کی منطق کو حرفِ آخر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔اس جملہ 'معترضہ کے بعد یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کے تنقیدی نقطۂ نظر کا سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ کلیم الدین احمد مغربی پیمانوں کے اطلاق کے معاملے میں اردو زبان کی لسانی، تہذیبی، ثقافتی حتیٰ کہ تاریخی قدروں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ جب کہ سرور صاحب کو اپنے ادب کی تہذیبی اقدار اور روایتی شناخت کا نہایت گہرا شعور حاصل ہے۔وہ کلیم صاحب کی طرح صدیوں سے پلی پلائی اور راسخ صنفِ سخن 'غزل' کو یک قلم مسترد کر دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب کہ کلیم صاحب بہ ہوش حواس تمام ثقافتی اور تاریخی اقدار سے صرفِ نظر کر لینے کا ارتکاب کر گزرتے ہیں۔

آل احمد سرور نے اقبال کے لہجے سے بحث کرتے ہوئے ایک جگہ براہ راست شاعری اور بالواسطہ شاعری کی معنویّت سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ ''اگر ہم بالواسطہ شاعری کو زیادہ اہمیّت دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم براہ راست شاعری کو سرے سے نظر انداز کر دیں''۔۔۔اگر سرور صاحب نے براہ راست شاعری میں شعری عناصر کی تلاش و جستجو کے موضوع پر قدرے تفصیل سے لکھا ہوتا تو توقع تھی کہ اس ضمن میں بعض عقدے مزید کھلتے۔تاہم اس نکتہ کو نظر انداز کر کے شاعری کے مختلف اسالیب کی قدر و قیمت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔اردو میں کچھ جدیدیّت کے زیر اثر اور کچھ مغرب میں علامت پسندی اور ہیئتی تنقید کے نتیجے میں شاعری کے لیے جس طرح تہہ داری، استعارہ سازی اور بالواسطہ طرزِ اظہار کو ادبی ترجیحات کی حیثیت حاصل ہوئی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیانیہ اسالیب اور براہ راست اظہار سے متعلق مسائل بڑی حد تک پس منظر میں چلے گئے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بیانیہ کی منطق، لہجے کی شناخت اور روزمرہ اور محاوروں پر مبنی لسانی ساخت بھی اپنے اندر شاعرانہ اظہار کا ایسا تنوع پیدا کر سکتی ہے جس کو شعریت کا ہی دوسرا نام دیا جا سکتا ہے۔علمِ بلاغت میں ایک مفہوم کو ادا کرنے کے نِت نئے اَسالیب کا اپنایا جانا اہمیت رکھتا ہے، محض تہہ دار اسلُوب اہمیت نہیں

رکھتا۔ اس لیے شعری اظہار کے ہر رنگ اور ہر انداز میں شعریت کی تلاش تو ضرور کی جا سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ تنقیدی تجزیہ اس شعریت کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے اور اس کے لیے اصول وضوابط کی تشکیل بھی کرے۔

اقبال کے خطیبانہ لہجے پر بعض بڑے کار آمد، نکات بیان کرنے کے بعد ''شکوہ اور جواب شکوہ'' میں موجود خطابت کو وہ اقبال کی قوّت بتاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر سرور صاحب کی تنقید جو یوں بھی تحسین سے اپنا دامن نہیں چھڑا پائی، غیر مشروط مداحی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اقبال کی توصیف میں تنقیدی توازن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور اس طرح کے تاثراتی جملوں کی تخلیق میں بھی کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے۔

> میرا خیال ہے کہ اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو اس کے لیے اقبال کی نظم یا ابوالکلام کی نثر منتخب ہوتی۔ یہ ذہن میں رہے کہ دونوں کے اسلُوب میں برگزیدگی، جو صحیفوں کی زبان کی سنجیدگی، جو بلند آہنگی اور شمشیر کی تیزی ہے وہ خطابت کی دین ہے۔ خطابت اقبال کی کمزوری نہیں طاقت ہے۔

ادب لطیف یا لطیف لکھنے کا یہ انداز اقبال کی شاعری اور ابولکلام آزاد کی نثر سے مصنف کی واقفیت کو تو ضرور ظاہر کرتا ہے مگر قرآن کریم کے اسلوب، لہجے، حتیٰ کہ محکمات اور مُتشابہات تک کی تنوع سے اس کی بے خبری اور لاتعلقی کو یقیناً بے نقاب کر دیتا ہے۔

سرور صاحب نے اقبال کی غزلوں پر بھی ایک ایسا مضمون قلم بند کیا ہے جس میں غزل کی زبان کو مرکزی نقطہ بنایا گیا ہے۔ اس مضمون میں یہ غلط نہیں کہا گیا ہے کہ اقبال کی غزل کے ذریعے اردو غزل کی زبان میں توسیع ہوئی ہے۔ لیکن یہ تشنگی بھی محسوس ہوتی ہے کہ اے کاش، مصنف نے اقبال کی لفظیات، اور لسانی طریق کار کا قدرے تفصیلی تجزیہ کیا ہوتا۔ اس مضمون کا نصف سے زیادہ حصہ اردو غزل کی زبان کے عام مسائل پر صرف ہوا ہے اور نصفِ کم تر کو اقبال کی مردف اور غیر مردف غزلوں کے اعداد وشمار اور نظم کی زبان کو غزل میں اور غزل کی زبان کو نظم میں استعمال کرنے جیسی پیش پا افتادہ باتوں کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ ویسے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زیر بحث مضمون میں سرور صاحب نے اقبال کی تلمیحات اور تراکیب کے ہجوم میں ان کے مُدّعا اور مافی الضمیر کو ہر جگہ بالا دست دکھایا ہے اور اس نکتہ کو ان الفاظ میں سلیقے کے ساتھ نمایاں کیا ہے:

> تلمیحات، تراکیب، استعارات، تشبیہات کی کثرت کے باوجود ہیرے کی طرح ترشے ہوئے خیال اور فن پر پوری قدرت کی وجہ سے ان کی غزلوں کے الفاظ میں زبان پر وہ فتح اور اقلیم معنی پر وہ اقتدار ملتا ہے جو بڑی شاعری کی پہچان ہے۔

سرور صاحب کا اسلوب بیان بلاشبہ بعض مقامات پر تنقیدی مقدّمات اور استدلال کو کمزور کرتا ہے، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنقیدی مکتب فکر کے اعتبار سے تاثراتی اسکول سے علاقہ نہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے موضوع کی باز آفرینی کی کوشش کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں۔ تخلیق کی باز آفرینی کے ساتھ سرور صاحب کا تہذیبی اور ثقافتی سیاق وسباق ان کی تنقید کو ایک بڑے تناظر کا حامل بنائے رکھتا ہے۔ اقبال کے معاملے میں ان کا تنقیدی امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اقبال کی شاعری پر کوئی باقاعدہ کتاب تو نہیں لکھی، لیکن اپنے مُعتَد بہ مضامین میں کم وبیش اقبال کی فکر اور فن کے تقریباً ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اقبال کی ممتاز

ترین نظموں کے امتیازات سے لے کر فکر و فلسفہ کی تاریخ میں اقبال کی انفرادیّت تک کو سرور صاحب نے بصیرت افروز نقطۂ نظر اور پختہ کار شعور و عرفان کے ساتھ دیکھا ہے اور پورے اقبال کی بازیافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔۔۔اس پس منظر میں آل احمد سرور کا شمار ممتاز ترین اقبال شناسوں میں عرصے تک ہوتا رہے گا۔۔۔